قسط پانزدھم:-

# میر کا سیاسی اور سماجی ماحول

جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب، استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

(سلسلہ کے لئے دیکھئے برہان اگست ۱۹۶۴ء)

---

تیراکی | اٹھارھویں صدی میں دہلی اور آگرے میں پیراکی کا رواج عام تھا، فرصت کے دن لوگ جمنا میں تیراکی کے مقابلے کیا کرتے تھے، اشرف علی صبوحی نے لکھا ہے:-

تیراکی کا یہ حال تھا کہ پالتی مارے ہوئے پانی پر بیٹھے ہیں جیسے مسند پر، ایک زانو پر پیچوان لگا ہوا ہے دوسرے پر رنڈی بیٹھی، دھواں اُڑاتے اور ملہار سُنتے چلے جاتے ہیں۔ قلعہ (معلّیٰ) کی حمام والی نہر تو دیکھی ہوگی، گز سوا گز کا پاٹ ہے اور بالشت بھر سے زیادہ گہرائی نہیں، اس میں آج کوئی مائی کا لال تیر کر دکھائے تو جانوں"

میر مچھلی تیراکی کے فن کے خاتم تھے[1] جمنا کے کنارے ایک بڑا شاندار میلہ لگتا تھا جس میں ہزاروں تماش بین جمع ہوتے تھے[2]

اسی طرح آگرہ میں بھی تیراکی کے مقابلے ہوا کرتے تھے، اور اس موقع پر میلہ لگتا تھا، نظیر اکبر آبادی نے ایک نظم اسی موضوع پر لکھی ہے، چند مناظر ملاحظہ ہوں:-

---

[1] دلی کی چند عجیب ہستیاں۔ ص ۱۵۹۔ [2] ایضاً ص ۱۰۲۔ (دلّی میں اب بھی "قدیمی لشکری فنِ تیراکی" کے نام سے ایک تیراکی کا مقابلہ ہوتا ہے۔ امسال ۳۰ اگست ۶۴ء کو یہ مقابلہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کی باؤلی میں ہوا تھا، آج کل دلّی میں خلیفہ عبدالجبار قریشی فنِ تیراکی کے مشہور استاد ہیں)

جب پیرنے کی رت میں دلدار پیرتے ہیں
عاشق بھی ساتھ ان کے غمخوار پیرتے ہیں
بھولے سیانے نادان ہوشیار پیرتے ہیں
پیر و جوان و لڑکے عیّار پیرتے ہیں
ادنیٰ غریب مفلس زردار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

جھرنے سے لے کے یار و سہجان کا تا نیالہ
چھتری سے بُرج خونی وارا کا چو نترا کا
مہتاب باغ سید تیلی قلعہ و روضا
غل شور کی بہاریں انبوہ سیر چرچا
ہر اک مکاں میں ہو کر ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

باغِ حکیم اور جو شیو داس کا چمن ہے
اُن میں جگہ جگہ پر مجلس ہے انجمن ہے
میوہ مٹھائی کھاتے اور ناچ دل لگن ہے
کچھ پیرنے کی دھو میں کچھ عیش کا چلن ہے
ہر ایک مکاں میں ہو کر ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں

برسات میں جو آکر چڑھتا ہے خوب دریا
ہر جا کھڑی[1] و چادر[2] بند اور ناند چکوا[3]

---

۱-۳ کھڑی لگانا پیراکی کی اصطلاح ہے اس میں کھڑے ہو کر پیرتے ہیں، اسی طرح دوسرے الفاظ بھی پیراکی کی مختلف قسموں کے نام ہیں۔

مینڈا بھنور اُچاٹن چکر سمیٹ[۱] مالا
مینڈا کھیر[۲] تختہ کستی[۳] پچھاڑ[۴] کرا[۵]
واں بھی ہنر سے اپنے ہشیار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں
ناؤں میں وہ جو گلرو ناچوں میں چھک رہے ہیں
جوڑے بدن میں رنگین گہنے بھبک رہے ہیں
تانیں ہوا میں اُڑتیں طبلے کھڑک رہے ہیں
عیش و طرب کی دھو میں پانی چھپک رہے ہیں
سو ٹھاٹھ کے بنا کر اطوار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں
ہر آن بولتے ہیں" ستید کبیر کی جے" !
پھر اس کے بعد" اپنے استاد پیر کی جے"!
مورو[۶] مکٹ کنھیا جمنا کے تیر[۷] کی جے !
پھر غول کے سب اپنے خورد و کبیر کی جے !
ہردم یہ کر خوشی کی گفتار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں
کیا کیا نظیر یاں کے ہیں پیرنے کی بانی
ہے جن کے پیرنے کی ملکوں میں آن مانی
استاد اور خلیفہ شاگرد یار جانی
سب خوش رہیں ہے جب تک جمنا کے بیچ پانی
کیا کیا ہنسی خوشی سے ہر بار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں[۸]

---
[۶] تاج ۔ [۷] کنارہ ۔ [۸] کلیات نظیر اکبر آبادی ص ۴۴۸ - ۴۵۱ -

میر:-

گریۂ زار میں بیتابیِ دل طُرفہ نہیں ؛ سیکڑوں کرتے ہیں پیراک ہنر پانی میں

رقص وسرود | رقص وسرود بادشاہوں، امیروں اور عوام کے لئے اندرونِ خانہ تفریح تھی، تقریبات اور خوشیوں کے مواقع پر ناچنے والوں اور والیوں کو بلایا جاتا تھا۔ تقریباً سارے ہی بڑے شہروں میں پیشہ ور رقاصائیں اور امرد بآسانی مل جاتے تھے، درگاہ قلی خان نے چوک سعد اللہ خان میں حسین وجمیل زیورات سے مزیّن امردوں کے رقص کا دلچسپ منظر پیش کیا ہے[1] انشاء اللہ خان انشاء کا بیان ہے کہ خواجہ قطب الدین[2] بختیار کاکی کے عرس کے موقع پر وہاں املی کے درختوں کے نیچے لونڈوں کے ناچ کی محفلیں جما کرتی تھیں۔ وہ لکھتا ہے:-

"لونڈے بھی ایسے کتھک کے کہ جن کو دیکھے پری بھی جھجک رہ جائے۔ سارے سر میں بال۔ کسی کے گلے میں فاختائی جوڑا، ——— کسی کے گلے میں طوطکی اور کسی کے گلے میں لال۔ قطب صاحب کی املیوں کی چھاؤں تلے جہاں وس بیٹھ کر اُس کو بلایا اور ناچ شروع ہوا، تہاں ہر ایک طرف ناچتے ناچتے سین بتا کے روبرو آکر بیٹھ گیا۔ ہر ایک نے ڈب میں سے پیسے نکال کر دینا شروع کئے۔ مثلاً چار فلوس جو تم نے دیئے تو پانچ فلوس میں نے بھی دیئے، اسی طرح —— ایک پھیرے بارہ ٹکے بلکہ پندرہ ٹکے کما لئے اور بیٹھے بیٹھے اُسی عالم کے بیچ دو ٹکے تم نے ڈب میں سے نکالے تو تین ٹکے میں نے بھی نکالے اور کسی یار نے چھ پیسے، کسی یار نے تین پیسے۔ آٹھ نو ٹکے تلشکری دمڑی ٹکے کی پاؤ سیر کے حساب لے کے، آدھی اُس لونڈے کو حوالے کی، اور آدھی میں ٹکڑا ٹکڑا سب یاروں نے کھایا"[2]

---

[1] مرقع دہلی۔ "ہر طرف رقصِ امارد خوش روقیامت آباد" ص ۱۵۔ [2] قطب صاحب، قصبہ اوش، جوما وراء النہر کے پرگنے میں واقع ہے، میں بتاریخ ۲۴/ ماہ رمضان المبارک ۵۴۸ھ بروز پنجشنبہ بعد نماز عصر تولّد ہوئے۔ والد کے انتقال کے وقت اُن کی عمر پانچ سال کی تھی۔ والدہ نے پرورش کی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اصفہان میں جاکر خواجہ معین الدین چشتی کے مرید ہوئے۔ اپنے پیر کے حکم کے مطابق دہلی تشریف لائے۔ اور "بہدایت خلق اللہ مشغول شد" آپ کا وصال ۱۴/ ربیع الاول ۶۳۳ھ کو ہوا۔ مزارِ مبارک مہرولی میں ہے جہاں ہر سال عرس کی رسم ادا ہوتی ہے اور ہندوستان کے دور دراز

(باقی بر صفحۂ آئندہ)

اورنگ زیب کے جانشینوں میں عالمگیر ثانی (۱۷۵۴ء - ۱۷۵۹ء) کے سوا تمام شاہانِ مغلیہ ناچنے والوں رقاصاؤں اور گویّوں کی سرپرستی کرتے تھے، انہیں دربار میں ملازم رکھا جاتا تھا اور عمدہ مناسب بھی دیئے جاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اٹھارھویں صدی میں رقص وسرود کا فن نقطۂ کمال پر پہونچ گیا تھا۔ جس کا کچھ اندازہ مرقع دہلی کے مطالعہ سے بھی ہوسکتا ہے۔ درگاہ قلی خاں نے دہلی کے اربابِ طرب کی ایک طویل فہرست دی ہے جن میں یہ نام شامل ہیں:-

نعمت خان بین نواز، نعمت خاں کا بھائی، تاج خان جانی وغلام رسول، باقر طنبورچی، حسن خاں ربابی غلام محمد سارنگی نواز، رحیم وتان سین، قاسم علی بین نواز، معین الدین قوال، برہانی قوال، برہانی امیر خان- رحیم خان جہانی، شجاعت خاں، ابراہیم خان، سوادخان، گھانسی رام پکھاوجی، حسین خان ڈھولک نواز- تہنا، شہباز دھمدی نواز، شاہ درویش سبوچہ نواز، نابینا ئے شکم نواز، تقی، شاہ دانیال، خواصی اور انوٹھا، سبزہ ومزہ، یاری نقال، جٹا قوال، معشوقۂ ابوالحسن، رحیم خان، گیان خان، دولت خان اور ٹڈو- رقاصائیں اور امرد رقاص | اللہ بندی، رجی امرد، ہینگا امرد، سلطانہ امرد، درگاہی، زنکولہ نواز، چنگ نواز سروپ روپ، نوربائی، چمنی، امر بیگم، رام جنی، چلک، ومانی، کالی گنگا، زینت وبھجی، گلاب، رمضانی رحمانی بائی، پنّا بائی، کمال بائی، اومائی، کنور، پنّا وتنّو وغیرہ۔[1]

محمد شاہ بادشاہ کے دربار میں ۲۲ رقاصائیں اور ۲۴ گویئے ملازم تھے۔[2] نوربائی بھی اسی کے دربار سے منسلک تھی، کہتے ہیں کہ اُس نے حسن وجمال کی دولت کے علاوہ بڑا رسیلا گلا بھی پایا تھا، اور اپنی اس خوبی کے باعث امرائے دربار کے دلوں پر قابض تھی۔ ایک دن نواب روشن الدولہ طرّہ باز خان کے ہاں وہ بیٹھی تھی کہ اُن کے

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) علاقوں سے زائرین آکر نذرِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ خاص طور پر اُن دنوں میں جب خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے عرس کا زمانہ ہوتا ہے۔ عوام کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ خواجہ اجمیریؒ کے مزار پر حاضر ہونے سے پہلے ان کے خلیفہ خواجہ قطب صاحب کے مزار پر حاضری دینا لازمی ہے۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو- سیر الاولیاء ص ۴۸ - ۵۷- سفینۃ الاولیاء (اردو ترجمہ) ص ۱۳۰ - ۱۳۱ - اخبار الاخیار (اردو ترجمہ) ص ۵۵ - ۵۸-

[1] برائے تفصیل۔ مرقع دہلی ص ۴۷ - ۸۲ [2] تاریخ شاکرخانی (قلمی) ص ۱۱۴ -

پیر و مرشد میران سید بھیک بھی آگئے۔ نواب صاحب نے انہیں دیکھ کر نور بائی کو کمرے میں چھپا دیا۔ دروازے پر چلمن ڈلوا دی۔ میران صاحب دیر تک بیٹھے رہے، نور بائی نے کچھ دیر تو برداشت کیا لیکن پھر تنہائی کی سنگینی سے تنگ آکر باہر آگئی اور میران صاحب کے حضور میں جھک کر مجرا پیش کیا۔

"حضور کی اجازت ہو تو لونڈی کچھ سنائے ؟"

نور بائی کی درخواست پر شیخ خاموش رہے۔ نور بائی نے اس کو "الخاموشی نیم رضا" سمجھا اور یہ رباعی بڑے پُرسوز لہجے میں شروع کی:-

شیخے بہ زنِ فاحشہ گفتا مستی　　کز خیر گسستی و بشر پیوستی
زن گفت چناں کہ می نمایم ہستم　　تو نیز چناں کہ می نمائی ہستی ؟

شیخ کی حالت یہ رباعی سن کر متغیر ہوگئی۔ وہ زمین پر مرغِ بسمل کی طرح لوٹنے لگے اور انہیں بڑی مشکل سے ہوش میں لایا گیا۔

نادر شاہ کی آمد پر قلعہ معلیٰ دہلی میں محمد شاہ بادشاہ نے ایک مجلسِ رقص منعقد کرائی اور بادشاہ نے اپنی منظورِ نظر نور بائی کو اس محفل میں بلوایا۔ نادر شاہ اس کے حسن و جمال اور مظاہرۂ کمال سے اتنا متاثر ہوا کہ اُسے اپنے ساتھ ایران لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہ سُن کر نور بائی بے ہوش ہوگئی اور محمد شاہ بادشاہ کے چہرے کا رنگ بھی اُڑ گیا۔ کیوں کہ وہ نور بائی کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ مرزا مہدی کے بیان کے مطابق نادر شاہ نور بائی[1] اور حکیم علوی خان[2] کو اپنے ساتھ ایران لے گیا تھا۔

امرا کے درباروں کا بھی یہی حال تھا۔ چوں کہ جنگ و جدل سے وہ منھ موڑ چکے تھے اور اپنا بیشتر وقت انھی تفریحی و لہو و لعب کے مشاغل میں صرف کرتے تھے، وہ نور بائی اور دیگر طوائفوں کے مکانوں کے چکر لگایا کرتے تھے، اُنہیں ہزاروں روپے صرف کرکے اپنے ہاں مدعو کیا کرتے تھے۔ درگاہ قلی خاں رقمطراز ہے:-

"رفعت شانشی (نور بائی) بمرتبہ کہ امرا بدیدنش التجا دارند و برخے بخانہ اش می روند خانہ اش چوں خانہ ارباب دولی سامان ہزار رنگ تجمل دربار...... درخانہ عمدہ ہا لہ

---

[1] تاریخ جہاں کشائی نادری۔ ص　[2] سفینۂ ہندی۔ ص ۱۳۸ - ۱۳۹ -

واردمی شود یک رقم جواہر رونما تواضع می کنند و مبلغ معتد بہ بخانہ اش می فرستند کہ قبول دعوت می کند۔ رخصانہ را ازہمیں قیاس باید کرد" [1]

رقص و سرود اور طوائفوں کی ہم جلیسی کا یہ شوق اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ جب امراء برائے شکار یا کسی مہم کے لئے جاتے تو اُن کے ساتھ گویّوں اور طوائفوں کی منڈلیاں بھی ہوتی تھیں [2]

ایک محمد شاہی امیر، عمدۃ الملک امیر خان انجام کی محفلِ رقص و سرود کا منظر ملاحظہ ہو:

سدا صحن میں اس کے رہتا تھا رنگ ❊ سدا تھی نوائے دف و نے و چنگ
کلاونت و قوال سب مل کے واں ❊ موسیقی استاد تھے بے گماں
جو قوال قول و غزل خواں تھا واں ❊ عرب محو مدہوش اسرار تھا واں
کوئی پٹہ دھرپت کو گاتا تھا واں ❊ ترانے سے دل کو لبھاتا تھا واں
عجب مل کے سازوں سے ہوتا تھا رنگ ❊ کہ تھی واں فلاطوں کی بھی عقل دنگ
کہیں ناچتے تھے ستار و منہ چنگ ❊ کہیں خنجری اور کہیں جل ترنگ
کہیں نے کہیں تھا جلاجل کا شور ❊ بجاتا تھا قانوں کو کوئی زور
غرض راگ سازوں کا یہاں تک تھا شور ❊ کہ پہونچے ہے کب شور یوم النشور
کہیں رقص کرتے تھے مہ طلعتاں ❊ کہیں دید کرتے تھے ساغر کشاں
یہ سب خوبرویانِ ہندی نژاد ❊ نمکسار زاد و نمک سار ساز
خوشی ہو کے آتے تھے جب رقص میں ❊ انہیں دیکھ آتے تھے سب رقص میں
غرض کیا کہوں بزم میں اس کی بات ❊ کہ اِندر کا بھی واں اکھاڑہ تھا مات [3]

اس عہد کے ادب اور مرقع دہلی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارھویں صدی میں مذہبی اور غیر مذہبی کوئی ایسی تقریب نہ تھی جس میں رقص و سرود کو لازمی قرار نہ دیا جاتا ہو، میلے ٹھیلوں میں ناچ گانے کا خاص طور پر

---

[1] مرقع دہلی ص ۷۳ - [2] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ چہار گلزار شجاعی (قلمی) ص ۴۰۹ - ۴۱۰ -
نیز سیر المتاخرین (فارسی) ج ۲- ص ۴۵۱ - [3] دیوانِ تاباں - ص ۲۶۵ - ۲۶۶ -

انتظام کیا جاتا تھا۔ بادشاہ سے لے کر پرجا تک ہر شخص اس رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا تھا۔ اکثر بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے، شاہ وارث الدین وارث کے دولت کدہ پر اکثر و بیشتر ناچ رنگ کی محفل منعقد ہوا کرتی تھی۔ [1]

**قوالی** قوالی کا بھی بہت رواج تھا۔ چشتی سلسلہ کے صوفیاء قوالی کو روحانی غذا سمجھتے تھے اور قوالوں کی سرپرستی کرتے تھے، رفتہ رفتہ عوام میں بھی اس کا ذوق سرایت کر گیا۔ حالانکہ صوفیاء کے نزدیک عوام کے لئے قوالی ممنوع تھی [2]۔ مختصر یہ کہ اٹھارھویں صدی میں عرسوں کی مجلسوں [3] کے علاوہ شاہانِ مغلیہ سے لے کر عوام تک ہر طرح کے لوگ یا تو اپنے ہاں مجلسِ قوالی منعقد کرتے تھے یا دوسروں کے ہاں جا کر سنتے تھے۔

شاہ عالم ثانی (۱۷۵۶ء - ۱۸۰۶ء) قوالی کا اتنا دلدادہ تھا کہ شاہی آداب کے خلاف وہ خواجہ میر درد کی تکیہ میں جا کر قوالی سنتا تھا۔ خواجہ صاحب کے ہاں ہر ماہ کی دوسری تاریخ کو محفلِ سماع ہوتی تھی۔ اور شہر کے عوام و خواص حاضر ہوتے تھے۔ مصحفی نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ علالت کی حالت میں بھی محفلِ قوالی سے محروم رہنا نہیں چاہتا تھا اور محفلِ سماع میں شرکت ضرور کرتا تھا۔ ایک دن وہ حالتِ علالت میں خواجہ صاحب کی محفل میں شریک ہوا۔ کافی دیر دوزانو بیٹھنے کے بعد اُسے کچھ کمزوری محسوس ہوئی اور اُس نے اپنے پیر دراز کر دیئے۔ خواجہ صاحب کو بادشاہ کی یہ حرکت محفلِ سماع کے آداب کے خلاف معلوم ہوئی۔ اُن کو غصہ آگیا اور انھوں نے بھی بادشاہ کی طرف پیر پھیلا دیئے، بادشاہ نے خواجہ صاحب کے اس طرزِ عمل سے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ دوزانو بیٹھ گیا۔ [4]

شاہ بھیک کے مرید و خلیفہ اور محمد شاہی امیر، روشن الدولہ کو بھی قوالی کا شغف تھا۔ وہ قوالی کی مجلسیں کرتا اور قوالوں کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا۔ [5] جُٹا قوال، نواب صمصام الدولہ کی سرکار سے وابستہ تھا۔ برہانی امیر خان اور رحیم خان جانی، نواب عمدۃ الملک امیر خان انجام کی سرکار سے منسلک تھے۔ [6] تاج خان قوال دہلی کے نامی گرامی قوالوں میں سے تھا۔ وہ شاہ بھیک کا مرید تھا، ہر ماہ کی ساتویں کو

---

[1] برائے تفصیل۔ مجموعۂ نغز۔ ص ج ۲۔ ص ۲۹۱۔ [2] سیر الاولیاء ص ۴۹۱-۵۳۴۔ [3] مرقع دہلی۔ ص ۱-۱۹۔

[4] تذکرۂ ہندی۔ ص ۹۲-۹۳۔ [5] چہار گلزار شجاعی۔ ص ۲۲۷۔ [6] مرقع دہلی۔ ص ۶۲۔

اپنے مکان پر قوالی کی محفل کرتا - برہانی قوال کے ہاں ہر سوموار کو قوالی ہوتی تھی - اِن محفلوں میں چھوٹے بڑے - امیر و غریب، تاجر اور پیشہ ور ہر طبقے کے لوگ شریک ہوتے تھے [1]

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ جہاں اٹھارھویں صدی میں سیاسی بدامنی، معاشرتی انحطاط، فقر و فاقہ، اقتصادی زبوں حالی اور بے روزگاری کا دور دورہ تھا وہاں فنِ موسیقی اپنے نقطۂ عروج پر پہونچا ہوا تھا۔ مثالیں اس زمانے کے فارسی تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں کثرت سے ملتی ہیں -

صوفیاء کے ہاں مجلسِ قوالی سے متعلق میرؔ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میرؔ کی، شب کو ؎ مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو
پھرتے ہیں چنانچہ لئے خدّام بِسلاتے ؎ درویشوں کے پیراہنِ صد چاک قصب کو

اس غزل پر شام سے تو صوفیوں کو وجد تھا
پھر نہیں معلوم کچھ مجلس کی کیا حالت ہوئی

**شب بازی** [2] یہ عوام کے لئے تفریحِ طبع کا بہت مروّج ذریعہ تھا۔ اٹاوہ اور دہلی کے شب باز اپنے فن میں مشہور و معروف تھے۔ اپنے سفر کے دوران میں محمد شاہ کا جب گذر اٹاوہ شہر کے قریب سے ہوا تو وہاں کے شب باز بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنے کرتب دکھائے۔ بطورِ انعام بادشاہ نے پانچ روپے دئے۔ [3]

**بھگت بازی** شمالی ہندوستان میں بھگت باز نامی ایک پیشہ ور طبقہ پایا جاتا تھا۔ اور اس فن سے اپنی روزی کماتا تھا - اِن تماشوں میں ہندو مسلمان دونوں برابر شرکت کرتے تھے۔ اپنے ڈراموں میں یہ لوگ مہابھارت کے مناظر پیش کرتے تھے، اِن میں سے ایک شخص مردانہ لباس زیبِ تن کرکے کرشن (کنہیا) کا کردار پیش کرتا تھا، اور دوسرے لوگ زنانہ لباس سے ملبوس اور زیورات سے مزیّن گوپیوں کا کردار ادا کرتے تھے۔ سوانگ کے دوران

---

[1] مرقع دہلی - ص ۵۸، ۶۰ - [2] فارسی میں شب بازی سوانگ اور کٹھ پتلی کے تماشے کے معنی میں مستعمل ہے -

روزِ روشن وقتِ صورت بازیِ آئینہ است ؎ ہست عیبی در ہنر آنرا کہ شب بازی کند

بحوالہ سفرنامہ آنندرام مخلص (مطبوعہ) (فٹ نوٹ - ۲) ص ۳۶ -

[3] سفرنامہ آنندرام مخلص - ص ۲۶ -

یں نقّال (ACTORS) کبیر داس کے کلام سے موقع کے مناسب سے گیت بھی گاتے جاتے تھے[۱] یہ سوانگ ہندوستان میں فنِ ڈرامہ کے ارتقا کے پیش خیمہ تھے۔ اور رفتہ رفتہ فنِ ڈرامہ مغربی ڈرامہ نگاری سے متاثر ہوا اور اب ہندوستان میں یہ فن کافی ترقی کر چکا ہے۔

دہلی کے مشہور ترین بھگت بازوں میں تقی نامی شخص کا شمار ہوتا تھا، اور وہ محمد شاہ کا منظورِ نظر بھی تھا۔ بڑے بڑے امراء اُسے اپنے مکان پر مدعو کرتے اور بڑے شوق سے اُس کی کرامات دیکھتے[۲] قاسم نے ذیل کے شعر میں دہلی کے بھگت بازوں کی تعریف کی ہے:۔

بھگت کا سانگ لایا کوہکن بھی ؛ باندازِ بھگت بازانِ دہلی[۳]

**نقّال** مغل بادشاہوں کے دربار سے نقّالوں اور لطیفہ گویوں کی منڈلیاں بھی وابستہ ہوتی تھیں[۴] عمدۃ الملک امیر خان انجام نے لطیفہ گوئی ہی کے فن کے ذریعہ محمد شاہ بادشاہ کے دربار تک رسائی پیدا کی تھی اور نمایاں ترقی بھی کی تھی۔ آخر میں الٰہ آباد کا صوبہ دار بھی مقرر ہوا تھا[۵] امیرزادہ لطیف خان کے دولت کدہ پر نقّالوں کی ایک محفل منعقد ہوا کرتی تھی۔ شہر کے نامی گرامی نقّال شرکت کرتے تھے۔ اس مجلس میں عوام و خواص کا جمِ غفیر حاضر ہوتا تھا۔[۶]

دہلی کے بازاروں اور بالخصوص چاندنی چوک میں شہر کے منتخب نقّال اور مسخرے جمع ہوتے اور جگہ جگہ اپنی دکان سجا کر ناظرین کو محظوظ کرتے تھے[۷] عرسوں میں بھی وہ لوگ موجود ہوتے تھے، اٹھارھویں صدی کے نقّالوں میں شاہ دانیال، انوٹھا اور یاری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں[۸]

**دوسرے کھیل اور تماشے** انشاء اللہ خان انشاء نے چند کھیلوں کا ذکر کیا ہے، جن میں بچّے اور بوڑھے دونوں دلچسپی لیتے تھے۔ مثلاً چنڈول گداگر بول، کاٹھ کٹوّل بالنسلی بھنبیری میرانانو، کالی پیلی ڈلو، چدّر چھپول۔

[۱] ملفوظِ رزّاقی۔ ص ۴۹، ۴۸۔ ۷۔ [۲] مرقع دہلی ص ۶۵ - ۶۶ - تاریخِ فرخ سیر پادشاہ (ق) ص ۲۶۶۔

[۳] کلیاتِ قاسم (ق) ص ۱۲۸۔ [۴] حدیقۃ الاقالیم۔ ۴۴۔ حافظ چندا، خواصی، مزا، یارو، لذّت، سبزہ اور بادل محمد شاہ کے درباری نقّال تھے۔ تاریخ شاکر خانی (ق) ص ۱۱۴۔ [۵] سفینۂ ہندی۔ ص ۷۔ [۶] مرقع دہلی ص ۲۹

[۷] مرقع دہلی۔ ص ۱۷۔ [۸] ایضاً ص ۶۵ - تا ۶۸۔

گھور گھنڈے چوہے لنڈرے، مونگ چنا ڈگڈوٹی ڈو۔ چھلا چھول، کالے پیلے دیو شیر بکری یا باگھ بکری، ایرلن کبڈی، وزیر بادشاہ۔ آنکھ مچولی۔ کڑوا تیل بلّی پادے دہی پھلیل، چھائیں مائیں گول گھمائیں راجہ گھر بیٹا ہوا۔ دوڑے آئیو کوئی ایسا بھی داتا ہو چڑیا کے بند چھڑا دے، لوڑھی ٹیسو رائے وغیرہ۔ لوہڑی کا کھیل، دہلی سے کابل تک مروّج تھا۔ اس کی تفصیل یوں ہے :۔ ہولی کے تہوار سے کچھ دنوں پہلے بچّے کچھ جوانوں کو اپنے ساتھ لے کر محلّہ محلّہ گشت لگاتے پھرتے تھے۔ اور ہر گھر سے کچھ نقدی زر یا ایندھن حاصل کرتے تھے اور ہولی کی مقررہ شب کو اس ایندھن کے انبار میں آگ لگاتے تھے، اِن ٹولیوں میں مسلمان بچّے بھی ہوتے تھے۔[۱]

**آنکھ مچولی** کم سن لڑکے اور لڑکیاں آنکھ مچولی کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔ اور آج بھی دیہاتوں اور قصبوں کے لڑکے اور لڑکیاں یہ کھیل کھیلتے ہیں۔ حسرت کے اشعار ہیں :۔

اگر شوق تجھے آنکھ مچولی سے ہے ؛ مجھ کو بھی کھیلنا تجھ اچپل سے ہے

کر بند میری آنکھ اور تو چھُپ جا ؛ میں ڈھونڈوں تجھے یہ کھیل اول سے ہے[۲]

**گلّی ڈنڈا**[۳] یہ بھی ہندوستان کے مشہور کھیلوں میں سے ہے۔ شہر اور دیہات وقصبات میں یکساں مقبول تھا۔[۴]

**آہو بازی** آہو بازی[۵] اور گل بازی[۶] امراء اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے تفریحی مشاغل تھے۔

**جھولا** قدیم زمانے سے ہندوستان کی عورتوں میں جھولے کا رواج تھا۔ ساون کے مہینے میں آج بھی یہ نظر آجاتا ہے۔ عام طور پر لڑکیاں گھروں کی کڑیوں میں رسّی ڈال کر جھولا بنا لیا کرتی ہیں۔ اٹھارھویں صدی میں تہواروں اور عرسوں کے مواقع کے میلوں میں بچّے اور جوان سبھی جھولا جھول کر اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔ انشاء اللہ خان انشاء کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے عرس کے موقع پر درگاہ کے قرب وجوار کی املیوں پر جھولا ڈالے جاتے تھے۔ اور وہاں پر یزادوں کا جمِ غفیر ہوتا تھا۔[۶]

**محلاتِ شاہی** نادراتِ شاہی، جو شاہِ عالم ثانی کے کلام کا مجموعہ ہے اور بزمِ آخر، جس میں منشی فیاض الدین نے دہلی کے دو آخری بادشاہوں یعنی اکبر ثانی (۱۸۰۶ء - ۱۸۳۹ء) اور بہادر شاہ ظفر (۱۸۳۹ء - ۱۸۵۷ء)

---

[۱] دریائے لطافت (اردو ترجمہ) ص ۲۱، ۱۳۱، ۱۳۲، [۲] دیوانِ حسرت (ق) ص ۱۶۹ (الف) [۳] برائے تفصیل دریائے لطافت (فارسی) ص ۷۷۔ [۴] ہرنوں کی لڑائی۔ [۵] پھولوں سے کھیل۔ [۶] دریائے لطافت (اردو ترجمہ ص ۱۰۰

کے طرزِ معاشرت کی تصویر پیش کی ہے، ان دونوں کتابوں کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی محلات کی زندگی میں عیش و عشرت، آرام و آسائش اور دفاع الوقتی کے سوا کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا، دن رات جشن میں گذرتے تھے، آخری چہار شنبہ، بسم اللہ خوانی، سال گرہ، بسنت، بکرید، جلوس کا جشن، چھٹی، دوالی، رتجگا ساچق، عید، گودھن پوجن، مہندی، شب برات، سرتی پوجن، عرس (پیر دستگیر عبدالقادر جیلانی) ہدیے کی شادی، ہولی کا جشن، بیاہ کی مہندی، نوروز کا جشن، پیروں کی نیاز کا جشن، خواجہ صاحب کی چھڑیاں، سلونو، پھولوں والوں کی سیر[۱] دن عید اور رات شب برات ہوتی تھی، گویا بزم ہی بزم تھی، رزم کا نام تک تھا۔

دہلی کے بازار | دہلی کے بازاروں کے بارے میں میر کے علاوہ دوسرے شعراء نے بھی بہت کچھ لکھا ہے:-

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے ؎ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہفت اقلیم ہر گلی ہے، کہیں ؎ دلّی سے بھی دیار ہوتے ہیں

دہلی کے دو بازار، چاندنی چوک اور چوک سعد اللہ خان، گویا سارے شہر کی جان تھے اور دہلی کی طرزِ معاشرت کا اصلی نمونہ اِن بازاروں میں دیکھا جاسکتا تھا۔ چوک سعد اللہ خان کی رونق کا یہ عالم تھا کہ اُس کو دیکھ کر مرغِ نظر حیرت کا شکار ہو جاتا تھا۔ درگاہ قلی خان رقمطراز ہے:-

"نظر از ملاحظہ محسوسات بنگارنگ دست و پا گم می کند، و نگاہ بمشاہدۂ تجدد امثال در تماشا و تعداد تمثال مواد تمنّا در آئینہ خانہ حیرت می نشیند"[۲]

ایک طرف:

"رقص امارد خوش رو قیامت آباد"

تھا تو دوسری طرف "کرسی ہائے چوبین از قبیل منابر نصب کردہ" جن پر کھڑے ہو کر پیشہ ور اور شیریں مقال واعظ ہر ماہ اور موقع کی مناسبت سے مضامین پر وعظ کہتے نظر آتے تھے، مثلاً ماہِ رمضان المبارک

---

[۱] وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے گذشتہ سال اس جشن کا احیا کیا تھا کیونکہ اسے ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا ذریعہ سمجھا گیا۔ امسال (۱۹۶۴ء) ۲۸ ستمبر کو یہ جشن منایا گیا۔ صدر جمہوریہ ہند اور وزیر اعظم اور شہر کے دوسرے ہندو مسلمانوں نے اس میں شرکت کی۔ [۲] مرقع دہلی۔ ص ۱۴ - ۱۵ -

میں اس ماہ کے فضائل اور روزے کے فوائد، حج کے مہینے میں حج کے مناسک، محرم الحرام میں ذکرِ شہادت اس طرح یہ واعظ عقیدہ تمندوں سے کافی دولت کمالیتے تھے۔ یہ رواج غدر سے پہلے تک تھا۔ غدر سے پہلے فوارے پر عیسائی مبلّغ بھی وعظ کہا کرتے تھے، کسی گوشے میں اہلِ تنجیم اور رمّال اپنی دوکان جمائے دکھائی دیتے۔ تو کسی کونے میں آتشک اور سوزاک کی دوا کی دوکان بھی نظر آتی، جہاں لوگوں کا اجتماع لگا ہوتا۔ ایک جانب اسلحہ فروشوں کی دوکانیں تھیں تو دوسری طرف میوہ فروشوں کی [1]

میر حسن دہلوی نے چاندنی چوک کی یوں تعریف کی ہے :-

یہ دل چسپ بازار تھا چوک کا　٭　کہ ٹھہرے جہاں پر وہیں دل لگا
جہاں تک کے رستے تھے بازار کے　٭　کہے تو کہ تختے تھے گلزار کے [2]

مختصر یہ کہ چاندنی چوک دہلی میں سب سے زیادہ دلفریب اور دل کش مقام تھا۔ اس بازار کے وسط میں ایک نہر بہتی تھی جس کے دونوں طرف کپڑے، جواہرات، عطریات، ظروف، سامانِ آرائش، آلاتِ حرب اور حقّوں وغیرہ کی دکانیں تھیں جن پر لوگوں کا جمگھٹا رہتا تھا، درگاہ قلی خان لکھتا ہے کہ ایک موقع پر ایک یتیم امیرزادہ چاندنی چوک کی سیر کو جانا چاہتا تھا۔ بیوہ ماں نے اپنے لڑکے کی خواہش پورا کرنے کی غرض سے تہیدستی کے عذر کے ساتھ ایک لاکھ روپے اُسے دیئے اور اس سے کہا :-

"ہر چند ازیں مبلغ نفائس و نوادر ایں چوک تحصیل نمی تواں کرد، لیکن چوں طبیعت عزیز القدر مصروف ایں معنی است ایں وجہ محقر یرا صرف ضروریات پسندِ خاطر باید نمود" [3]

اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ چاندنی چوک کی دوکانوں میں لاکھوں روپے کا ایسا نفیس اور نادر سامان مہیا رہتا تھا کہ ایک لاکھ روپیہ بھی وہاں کچھ معنی نہیں رکھتا تھا۔

قہوہ خانے　اس بازار میں قہوے خانے بھی تھے جہاں دہلی کے شعراء جمع ہوتے تھے۔

چنڈوخانے　بھی تھے جن میں بے فکرے بیٹھ کر عالم بالا کی سیر کرتے تھے اور یہاں سے پھر افواہیں پھیلتی تھیں۔ جن کے نتائج نادرشاہ کے قتلِ عام کی صورت میں بھی ظاہر ہوئے۔

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مرقع دہلی۔ ص ۱۷-۱۹ - [2] مجموعہ مثنویات میر حسن دہلوی۔ ص ۱۵ - [3] مرقع دہلی ص ۲۹

مدرسے | مغل بادشاہوں کو علم و ادب سے بڑی دلچسپی تھی اور انھوں نے اس کو فروغ دینے میں حتی الوسع کوششیں بھی کی تھیں جن کے تفصیل سے ذکر کی گنجائش نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ اورنگ زیب نے ملک بھر میں مدرسے قائم کئے تھے۔ سجان رائے بھنڈاری کا بیان ہے :۔

"درکوچہ و بازار و ہر صحن و برزن مساجد و معابد و خوانق و مدارس کہ عالمیان ازاں بہرہ دنیا و عقبیٰ و فائدہ صورت و معانی حاصل نمایند، تعمیر یافتہ "[۱]

اساتذہ اور طلباء کو ماہانہ وظائف سرکار کی طرف سے دیئے جاتے تھے۔ اس طرح بطور امداد سرکار اچھی خاصی رقم علم و ادب کو فروغ دینے پر صرف کرتی تھی۔[۲] لیکن اٹھارھویں صدی کے سیاسی انحطاط اور اقتصادی زبوں حالی و بدامنی کے سبب سے بقول مصنفِ تاریخِ محمد شاہی :۔

"نہ مدرس را شغلِ کتاب و نہ در مدرسہ طالبِ علم و ذکر نبی و اصحاب خانقاہ ویران و درویشان خراب، از مسجد مؤذّن و خطیب را بنا برفکرِ روزی احتساب "[۳]

مگر ان تمام نامساعد حالات کے باوجود دہلی میں چند مدرسے قائم تھے۔ کچھ تو ایسے تھے جو خانقاہوں اور مسجدوں سے منسلک تھے، اور کچھ علیحدہ تعلیم گاہوں کی شکل میں تھے، شمالی ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے شہر اور قصبے میں علیحدہ مدرسے تھے ویسے تو ہر مسجد سے مکتب منسلک تھا چاہے وہ مسجد دیہات ہی میں کیوں نہ ہو۔

مدرسۂ رحیمیہ | اس کے بانی شاہ ولی اللہؒ کے والدِ بزرگوار شاہ عبدالرحیم تھے، یہ محلہ "مہندیان" کے قریب واقع تھا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں اب مولانا آزاد میڈیکل کالج کی عمارت ہے۔ شاہ عبدالرحیم نے اس مدرسہ میں حدیث کی تعلیم دینا شروع کیا۔ دور دور سے طالبِ علم اس مدرسے میں تحصیلِ علم کے لئے آتے تھے۔ مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد شاہ ولی اللہ نے اس مدرسہ کی نگرانی شروع کی اور اُن کی حیات میں یہ مدرسہ تعلیم حدیث کا شمالی ہندوستان میں واحد مرکز بن گیا۔ طالب علموں کی کثرت کی وجہ سے محمد شاہ بادشاہ نے شاہ صاحب کو ایک حویلی مدرسہ کے لئے عنایت کی تھی۔ ۱۸۵۷ء تک یہ مدرسہ قائم رہا۔ غدر میں برباد ہو گیا۔ ترکمان دروازہ اور چتلی قبر کے درمیان یہ محلہ آج بھی مدرسہ شاہ عبدالعزیز کے نام سے مشہور ہے[۴]

---

۱۔ خلاصۃ التواریخ۔ ص ۳۱ ۔ ۲۔ برائے تفصیل ۔ تاریخ عالم گیر (ق) ص ۷۰ ب ۔ ۳۔ تاریخ محمد شاہی (ق) ۱۵۸ الف ۔
۴۔ برائے تفصیل، واقعات دارالحکومت دہلی ۔ ج ۲۔ ص ۲۸۶، نیز حیاتِ ولی ۔ ص ۲۳۱ ۔

اس مدرسہ کے سیکڑوں طلباء کو حافظ رحمت خاں[1] کی سرکار سے وظائف ملتے تھے[2]۔ نجیب الدولہ[3] علم و علماء کی بہت سرپرستی کرتا تھا۔ شاہ عبدالعزیز کا بیان ہے کہ اس کے دربار سے نوسو (۹۰۰) علماء وابستہ تھے۔ اور اُن کے وظائف پانچ روپے سے پانچ سو روپے تک مقرر تھے[4]

**مدرسۂ بازار خانم** حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی[5] کی خانقاہ دہلی کے مشہور بازار خانم[6] میں تھی۔ جس سے منسلک ایک مدرسہ بھی تھا جو علم و ادب اور روحانی احیاء کا بہت بڑا مرکز تھا۔ دہلی کے گرد و نواح میں شاہ صاحب کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی اور بڑی تعداد میں وہاں طلباء آتے تھے۔ اس مدرسہ کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ شجرۃ الانوار کے ایک بیان سے اس مدرسہ کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ:

"بسیار طلبۂ علم آمدہ سکونت می نمودند وسبق کتب ہائے خواندو نان و پارچہ نیز از سرکار یافتند"[7]

یہ مدرسہ بلکہ وہ پورا علاقہ غدر کے بعد منہدم کر دیا گیا، اور وہاں کی آبادی تباہ و برباد ہوئی۔
مناقب المحبوبین میں لکھا ہے:۔

"درسال غدر چوں نصاریٰ بر اہل اسلام دہلی فتح یافتند مکانہائے کہ قریب لعل قلعہ بودند ہمہ را منہدم کردند"[8]

غالب ایک خط میں سید احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں :۔

"شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مقبرہ اُجڑ گیا، ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی، اُن کی اولاد کے

---

[1] برائے سوانح حیات ملاحظہ ہو۔ حیات حافظ رحمت خاں۔ مؤلفہ سید الطاف علی۔ [2] الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر) ص ۱۸۰ - [3] برائے سوانح ملاحظہ ہو۔ نجیب الدولہ (انگریزی) مؤلفہ پروفیسر شیخ عبدالرشید (علی گڑھ)۔
[4] ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی۔ ص ۸۱، نیز مجموعۂ نغز (مقدمہ) ص کسط۔ [5] برائے سوانح ملاحظہ ہو۔ تاریخ مشائخ چشت۔ مؤلفہ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ ص ۳۶۶ - ۴۲۲ - [6] بازار خانم لال قلعہ کے برابر تھا۔ برائے تفصیل، واقعات دار الحکومت دہلی۔ ج ۲ ۔ ص ۱۱۱ - [7] شجرۃ الانوار (قلمی) مملوکہ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ علی گڈھ) [8] مناقب المحبوبین ۔ ص ۴۵ -

لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے، اور میدان میں قبر، اس کے سوا کچھ نہیں، وہاں کے رہنے والے گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں" [۱]

اب یہ علاقہ پریڈ گراونڈ کہلاتا ہے۔ اور اب وہاں مولانا آزاد کا مقبرہ تعمیر ہوا ہے۔ اس علاقے کے منہدم ہونے کا بیّن ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ کچھ دنوں پہلے دہلی کارپوریشن نے اس علاقے کی کھدائی کروائی تو وہاں مکانوں کی دیواریں اور مضبوط بنیادیں ملیں علاوہ ازیں دو مزار بھی مٹی میں دبے ہوئے نکلے۔ چوں کہ لوحِ مزار کو فوراً لال قلعہ میں محفوظ کر دیا گیا تھا۔ اس وجہ سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ مزارات کن بزرگوں کے تھے۔

**مدرسہ غازی الدین خاں** | نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ نے یہ مدرسہ اجمیری دروازہ کے متصل تعمیر کروایا تھا۔[۲] جب شاہ فخر الدین[۳] اورنگ آباد (دکن) سے دہلی تشریف لائے تھے تو انھوں نے اسی مدرسہ میں قیام فرمایا تھا اور درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا تھا۔

شجرۃ الانوار کے مصنف کا بیان ہے:۔

"در مدرسہ خورد غیاض (غازی) الدین خان مرحوم کہ بیرونِ اجمیری دروازہ واقع است سکونت ورزیدند و ارشاد و تدریس اشتغال نمودند مرجعِ خاص وعام شدند" [۴]

مندرجہ بالا مشہور مدرسوں کے علاوہ ہم عصر ادب میں دوسرے مدرسوں کے صرف حوالے ملتے ہیں، دہلی کی جامع مسجد سے بھی ایک مدرسہ وابستہ تھا۔ نادر شاہ کے قتلِ عام میں جامع مسجد کو بہت نقصان پہونچا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں علماء، صوفیاء اور طلباء شہید کر دیئے گئے تھے، مرزا محمد کام بخش کہتا ہے:۔

"بالکل سکنۂ آں کہ اکثری از آنہا اولیاء اللہ و علماء و فضلای ملّت اسلام بودند و ہر کدا می در رکنِ از ارکان مسجد مقام طاعت و عبادتِ الٰہی و صلوٰۃ درود حضرت رسولؐ پناہ و مدرسہ تدریس علومِ شرعی از تلاوتِ قرآن و احادیث شریف و فقہ مذہبِ حنیفؒ ساختہ شب و روز

---

[۱] اردوئے معلیٰ، حصۂ اول۔ ص ۱۸۳-۱۸۴۔ [۲] تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن دہلوی) ص ۸۱۔ [۳] برائے سوانح ملاحظہ ہو۔ تاریخ مشائخ چشت۔ ص ۴۶۰-۵۲۹۔ [۴] چہار گلزارِ شجاعی (ق) ص ۱۳۰۔

بتعلیم خلق اللہ درآں زاد یہ عزلت مشغول ...... بودند۔ صغیر وکبیر شاگرد واستاد و مرید ومرشد را بالقتل رسانیدہ وشہید ساختند "[1]

مدرسہ اعتماد الدولہ محمد امین خان، اجمیری دروازہ کے باہر اسی مقام پر تھا۔ جہاں اُس کی قبر ہے۔[2]
کوچہ بلاقی بیگم میں ایک مدرسہ تھا جو اس کوچہ کے نام سے مشہور تھا۔[3] مدرسہ محمد غیاث الدین خان، دہلی کے محلہ مغل پورہ میں ۱۱۴۸ھ میں قائم کیا گیا تھا۔[4] اس کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔

خانقاہیں | ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام کے بعد سے دہلی روحانی تعلیم وتربیت کا بہت بڑا مرکز تھی۔ اور ہر سلسلے کے بلند مرتبہ بزرگ اور مشائخ۔ یہاں جلوہ افروز تھے۔ رشد وہدایت کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ شاہ عبدالعزیز کا یہ قول بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ:-

" در عہد محمد شاہ بادشاہ بست و دو بزرگ صاحب ارشاد از ہر خانوادہ در دہلی بودند وایں چنیں اتفاق کم می شود "[5]

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی، شاہ فخر الدین دہلوی، مرزا مظہر جانِ جاناں، خواجہ میر درد، سعد اللہ گلشن وغیرہ کی ایسی خانقاہیں تھیں جہاں سے رشد وہدایت کے چشمے جاری تھے، غدر سے کچھ زمانے پہلے تک یہ خانقاہیں بارونق رہیں، اِن خانقاہوں کے بارے میں پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ ان میں:

" تزکیۂ باطن وتہذیبِ نفس کے درس دیئے جاتے تھے، اور باطنی زندگی کو سنوارنے کے لئے رات دن کوششیں جاری رہتی تھیں "۔[6]

---

[1] تاریخِ شہادت فرخ سیر وجلوس محمد شاہ بادشاہ (ق) ج ۲۔ ص ۲۷۲ ب۔ [2] تاریخ ہندی (ق) ص ۴۹۳
[3] کلیاتِ عزیزی (ق) حصہ اول ص ۷ الف وب۔ [4] مآثر الامراء (فارسی) ج ۳ ص ۷۷۰۔
[5] ملفوظاتِ شاہ عبدالعزیز دہلوی۔ ص ۳۴۔ [6] تاریخ مشائخ چشت۔ ص ۳۴۵۔

(باقی)